# حادثاتی ہمسائے مجبوری کے دوست

تحریر: سہیل احمد لون

فلم میکنگ میں ماسٹر کلاسز میں ڈاکومنٹری بنانا بھی ہماری اسائنمنٹ کا حصہ ہے۔گزشتہ ماہ ہمیں کلاس میں اپنی ڈاکومنٹری کے لیے آئیڈیا پچ کرنا تھا تو میں اور میرے ہم جماعت سعد علی گل نے لندن میں اولڈ ہوم پر ڈاکومنٹری بنانے کا خیال ظاہر کیا تو اس پر کلاس ٹیچرز نے کچھ تحفظات کا اظہار کیا۔ان کا خیال تھا چونکہ ہمارا تعلق پاکستان سے ہے اور ہماری ثقافت اور خاندانی اقدار میں والدین کو اولڈ ہوم چھوڑ آنا اچھا تصور نہیں کیا جاتا شاید اس لیے ہم یہاں اولڈ ہوم میں رہنے والے بزرگوں پر ترس کھا کر ان کی اولڈ ہوم میں مقید زندگی دنیا کو منفی انداز سے دکھانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ یہاں میڈیا میں کچھ ایسی باتیں سامنے آئیں تھیں جس کے بعد اولڈ ہومز کی انتظامیہ اب کسی کو وہاں شوٹنگ کی اجازت نہیں دیتی۔کافی بحث مباحثہ کرنے کے بعد ہم نے اپنے ٹیچرز سے اجازت مل گئی مگر اس کے بعد کسی اولڈ ہوم میں شوٹنگ کرنے کی اجازت لینا ایسا ہی مشکل کام ثابت ہوا جیسے پاکستان میں کسی غریب اور ایماندز آدمی کا ''وزیر'' بن جانا۔جب تھوڑی سی ریسرچ کی تو اس بات پر بڑی حیرانگی ہوئی کہ تقریباً پانچ میل کی ریڈیس میں اکیس اولڈ ہوم ہمارے علاقے میں موجود تھے۔جب انسان سچے دل سے کچھ کرنا چاہے تو اللہ تعالی بھی کسی انسان میں رحم پیدا کر کے اس کو وسیلہ بنا دیتا ہے۔ہماری انتھک محنت کے نتیجے میں بالآخر ایک اولڈ ہوم کی مینجر نے ہمیں وہاں شوٹنگ کرنے کی اجازت دے دی۔اس کے بعد ہم نے تمام کاغذی کارروائی مکمل کی جب اولڈ ہوم میں رہنے والوں نے یا ان کے سرپرستوں نے راضی نامہ پر دستخط کر دیے تو ہم اپنی ٹیم لے کر وہاں پہنچ گئے۔اس سے قبل ہم نے تین بار وہاں بغیر کیمرے کے کچھ وقت بھی گزارہ تا کہ وہاں کے مکینوں کی روزمرہ کی مصروفیات جاننے کے علاوہ ان سے کچھ دوستی بھی ہو جائے تا کہ شوٹنگ کے دوران آسانی رہے۔ایک مخصوص چار دیواری میں جہاں انسانیت کے سوا کسی سے کوئی رشتہ نہ ہو زندگی کا سفر اپنی آخری منزل تک گزارنا واقعی ہی بڑا مشکل کام ہے۔وہاں موجود لوگوں کی بنیادی ضروریات کا خیال بھرپور انداز میں رکھا جاتا ہے مگر آج وہ اسی کرب سے گزر رہے ہیں جس میں ان کے بڑے گزرے تھے اور جو ان کو یہاں چھوڑ گئے ہیں وہ بھی ذہنی طور پر تیار ہیں کہ انکی زندگی کا آخری سٹیشن بھی کوئی اولڈ ہوم ہی ہو گا۔

ہر انسان کی زندگی ایک کہانی ہوتی ہے بقول شیکسپیئر یہ دنیا ایک سٹیج ہے اور ہم سب ایکٹر ہیں اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور پردے کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔اولڈ ہوم میں موجود تمام لوگ بھی کسی ڈرامے کے کرداروں کی طرح محسوس ہوئے جس میں کوئی لیڈ رول کر رہا تھا کوئی Mirror Character، کوئی خاموشی کی زبان میں اپنا کردار نبھا رہا تھا تو کوئی چلبلا پن کر کے۔وہاں پر موجود ستر سالہ خاتون جس کا نام باربرا تھا ''ملکہ مکھی'' کی طرح تھی جیسے شہد کی مکھیاں ملکہ مکھی کے پیچھے ہوتی ہیں۔خوش گپیوں میں ہر وقت مشغول رہنے والی باربرا بھی جہاں بیٹھ جاتی وہاں رہنے والے تمام لوگ اس کی صحبت میں بیٹھ جاتے ،بس یہی وہ وقت ہوتا جب کسی کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی چاہے

وہ پھیکی ہو یا اداس۔ وہاں پر موجود ایک کردار بڑا پر اسرار دکھائی دیا جسے دیکھ کر ایسا گمان ہوتا تھا جیسے وہ یہاں رہنے نہیں بلکہ جاسوسی کرنے آیا ہو۔ چند بار کی ملاقات کے بعد ان سے بات کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ وہ 83 برس کے تھے جسمانی طور پر کافی فٹ تھے مگر ذہنی سطح کا یہ عالم تھا کہ سوائے دوسری جنگ عظیم کے ان کو کوئی بات یاد نہیں تھی۔ ان کا نام Bill تھا۔ وہ انگریزی، اطالوی، جرمن، فرانسیسی، اور ہوبو سمیت پانچ زبانیں جاننے کے علاوہ عربی زبان میں بڑے اچھی سر تال میں گانا بھی گاتے تھے۔ موسیقی واقعی ہی روح کی غذا ہے ۔ جب Bill نے اپنی بوڑھی انگلیوں کو پیانو کی Keys کو چھیڑا تو ان سے نکلنے والی سریلی آواز نے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تمام لوگوں کے دلوں کے جل ترنگ بجا دیے۔ بل کو دیکھ کر وہاں موجود پچاسی سالہ ایڈورڈ نے بھی اپنی انگلیوں کو وارم اپ کرنا شروع کر دیا اور Piano سے ایسی دھنیں نکالیں کہ سب جھومنے پر مجبور ہو گئے۔ Bill نے فرانس سے فلاسفی کی ڈگری کی تھی شاید یہ اس کا اثر تھا کہ اس سے جو بات بھی پوچھی اس نے اس کا ایسا جواب دیا جس کے معنی بہت گہرے تھے۔ صاف گوئی کا یہ عالم تھا کہ اس نے کہا کہ یہاں اولڈ ہوم میں ہم سب مل کر ہنسی خوشی رہ رہے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم آپس میں دوست ہیں۔ ہم حادثاتی طور یہاں اکٹھے ہو گئے ہیں اور ہمارا آپس میں رشتہ دوستی نہیں بلکہ acquaintance ہے۔ وہاں پر رہنے والی ایک خاتون تیرہ فروری کو اپنی 102 ویں سالگرہ بھی منا رہی ہے۔ حیران کن طور پر کچھ ایسے کردار بھی وہاں دیکھے جن کو آج تک کوئی ملنے نہیں آیا اور ایک خوش نصیب ایسی بھی تھی جس کا بیٹا روزانہ اس کی قدم بوسی کے لیے آتا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ شاید وہ چاہنے کے باوجود اپنی ماں کو اپنے پاس گھر میں نہیں رکھ سکا۔ رضا کارانہ طور پر کام کرنے والوں کا جذبہ بھی قابل دید تھا جن کے اپنے ان کو میٹھی قید میں چھوڑ گئے وہاں ایسے لوگ ان کی خدمت کرنے آ جاتے ہیں جس کا نہ تو وہ کوئی معاوضہ لیتے ہیں اور نہ ہی ان کے دماغ میں "ثواب" کا کوئی تصور ہے۔ وہاں رہنے والے اکثر dementia جیسی بیماری میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے ان کی یادداشت بھی متاثر ہوئی ہے۔ اللہ تعالی نے انسان میں بھول جانے کی صفت بھی شاید کسی خاص مقصد کے تحت رکھی ہے ورنہ جتنے ہم دنیا دار ہیں اگر ہر بات یاد رہ جائے تو ہماری زندگی دنیا میں ہی عذاب بن جائے۔ اولڈ ہوم جب ہم پہلی بار گئے تو ہم کو اس بات کا دکھ ہوا تھا کہ یہاں موجود لوگوں کی اکثریت اپنا ماضی بھول چکی ہے۔ حیران کن طور پر ان کو وہ باتیں نہیں بھولیں جن کو یاد کر کے وہ خود تو خوش ہوتے ہیں ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں کے چہروں پر بھی مسکراہٹ لے آتے تھے۔ جب پیانو پر 60 اور 70 کے عشرے کے گانوں کی دھن بجائی گئی تو سب لوگ ساتھ ساتھ گنگنا بھی رہے تھے۔ ایک عورت نے Elvis Presley کا گانا سنایا تو سب نے اس کے ساتھ کورس کی شکل میں گانا شروع کر دیا۔ یہ سب دیکھ کر میں آج بھی سوچ رہا ہوں کہ ان کو تلخ حقیقتیں بھول گئیں ہیں یا انہوں نے بھلا دی ہیں۔ پچاس برس پرانے گانے اور دھنیں ان کو یاد ہیں مگر اپنے بچوں کا ان کو علم نہیں.....! انسان کا جسم اور دماغ بھلے بوڑھا ہو جائے مگر اس کا دل اگر جوان ہے تو قید چاہے میٹھی ہو یا کڑوی اس سے وہ ہنس کر گزار دیتا ہے۔

تحریر: سہیل احمد لون

سربٹن۔سرے

sohailloun@gmail.com

11-02-2017